از جناب میاں بشیر احمد صاحب اسسٹنٹ پروفیسر
ادارۂ تعلیم و تحقیق پشاور یونیورسٹی

ابن خلدونؒ، شاہ ولی اللہؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ
کے
تعلیمی نظریات و اصول

ابن خلدون بحیثیت ایک مفکر تعلیم | قدرت نے ابن خلدون کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ بیک وقت عالم دین بھی تھا اور سیاستدان بھی۔ مورخ بھی اور جغرافیہ دان بھی۔ فلسفۂ تاریخ کا بانی بھی تھا اور فلسفہ عمرانیات کا پیشرو بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ماہر تعلیم اور معلم تھا۔ درس و تدریس اور فلسفۂ تعلیم میں جس بالغ نظری و وسعت فکر کا ثبوت ابن خلدون نے ہمیں دیا ہے۔ وہ اس کی خداداد قابلیت اور ذہانت پر دلالت کرتی ہے۔

ابن خلدون نے تمام علوم کو دو شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبعی علوم اور نقلی علوم۔

طبعی علوم سے مراد وہ علوم ہیں جن کے بارے میں انسان خود اپنی فکر سے کام لیتا ہے۔ خود اپنے قوائے عقلیہ سے ان کے موضوعات۔ مسائل۔ دلائل اور وجوہ تعلیم کی معلومات اکٹھی کرتا ہے۔ اور انسان خالصتہً اپنی ذہنی طاقتوں سے کام لے کر ان علوم میں مہارت پیدا کرتا ہے۔

نقلی علوم سے مراد وہ علوم ہیں جو کسی وسیلے سے انسان تک پہنچتے ہیں اور انسان محض اپنی عقل کی رسائی سے ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ابن خلدون کے نزدیک قوموں کی نشوونما اور ارتقا میں ہر دو علوم بہت ادا کرتے ہیں۔

مقصد تعلیم | انسان نے اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے اپنی مخصوص قوتِ فکر کو کام میں لا کر عمرانی زندگی کی بنیاد ڈالی۔ اگر اس کا بنظر عمیق جائزہ لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قوت فکر ہی انسان کو حیوان سے بلند مرتبہ دلاتی ہے۔ لہٰذا تعلیم کا اولیں مقصد ابن خلدون کے نزدیک علم معرفت یا علم حقیقت حاصل کرنا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدرت نے انسان کو حواس خمسہ دیے ہیں۔ لیکن حواس خمسہ سطحی علم کی بنیاد ہیں۔ علم معرفت حاصل کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔ علم معرفت حاصل کرنے کے لئے ایک اعلیٰ حس ہے جس سے صرف

وہ افراد فیض یاب ہوتے ہیں جنہیں پیغمبر کہا جاتا ہے۔ ہر انسان کا فرض اولین ہے کہ وہ ان احکام پر ایمان لائیں جو کہ پیغمبروں نے ہم تک پہنچائے ہیں۔ چنانچہ ان احکامات پر ایمان لانا علم معرفت کی پہلی سیڑھی ہے۔ علم معرفت حاصل کرنے کے لیئے ایمان کی پختگی ضروری ہے۔ ایمان کی پختگی کے بعد انسان علم حاصل کرے اور حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کرے۔

طریقۂ تعلیم | ابن خلدون اپنے دور کے معیارِ تعلیم سے مطمئن نہ تھا۔ اسے شکایت تھی کہ طلبہ برسوں کے بعد بھی علم میں مہارت حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کے نزدیک علم میں ملکہ و مہارت حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے کہ طلبا کو بحث و مباحثہ کا عادی بنایا جائے۔ اور انہیں ایسے مواقع میسر ہوں کہ وہ علمی مسائل پر تحقیقی گفتگو کر سکیں۔ آج جب مغربی مفکرین بحث و سیمینار کے طریق کو دوسرے طریقوں پر ترجیح دیتے ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے عظیم مسلمان مفکر تعلیم نے اسی طریق کا پرچار چودھویں صدی عیسوی میں کیا تھا۔

۲۔ ابن خلدون نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک فن پڑھایا جائے۔ دو علم بیک وقت نہ پڑھائے جائیں۔ اس سے توجہ بٹ جاتی ہے۔ اور طالب علم کورے کا کورا رہ جاتا ہے۔ اس لئے قدیم نصاب کی ایسی کتابیں جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کر دیئے گئے ہیں نصاب سے خارج کر دیئے جائیں اور ہر فن اور ہر علم میں صرف وہی کتابیں رکھی جائیں جن میں صرف اسی فن اور اسی علم پر بحث ہو۔

۳۔ تدریس میں آسان سے مشکل کی طرف اقدام کرنا چاہیئے نہ کہ مشکل سے آسان کی طرف۔

۴۔ ابن خلدون تعلیم کے اس اصول کا بھی حامی ہے کہ ہمیں تعلیم کا آغاز گرد و پیش کی چیزوں کو بطور مثال پیش کر کے کرنا چاہیئے۔ یہ اس لئے کہ بچے حسی اور مقرون مثالوں سے مختلف مسائل آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔

۵۔ مختلف مسائل پڑھاتے وقت بچوں کی علمی استعداد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بچے کا ذہن جس چیز کو سمجھنے سے قاصر ہو اس کی تعلیم سے پرہیز بہتر ہے۔

۶۔ ابن خلدون نے اس بات کی تلقین کی ہے کہ ہمیں تعلیم کا آغاز مادری زبان میں کرنا چاہیئے کیونکہ اجنبی زبان میں تعلیم نصف تعلیم کے مترادف ہے۔

۷۔ ابنِ خلدون شاگردوں کے بارے میں خاص طور پر ہدایت کرتا ہے۔ کہ ہمیں شاگردوں کے ساتھ نہایت ہمدردی سے پیش آنا چاہیئے وہ بچوں کی ہمہ گیر نشوونما کا قائل ہے۔ اور بچوں کی معقول تربیت پر بڑا زور دیتا ہے لیکن اس بات کا سخت مخالف ہے کہ ان کی تربیت کے دوران ان پر کسی قسم کا تشدد روا رکھا جائے۔ ابن خلدون نے اساتذہ اور والدین کو تشدد سے باز رکھنے کی تلقین کی ہے۔ تشدد بچوں میں تمام بری عادتیں پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً جھوٹ بولنے اور بہانے تراشنے کی عادت ان میں پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس کے

ساتھ ساتھ غیرت کا مادہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اساتذہ کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ شاگردوں سے پیار و محبت سے پیش آئیں۔ اس طرح شروع ہی سے بچوں میں نیک عادات کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔

یہ ہیں وہ تعلیمی نظریات جن کو علامہ ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کے مقدمہ میں بیان کیا ہے اور جن کے مطالعہ کے بعد ابن خلدون کے بے پناہ علمی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی خدمات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اسلاف میں ایسے موتی پنہاں ہیں جن کی علمی بصیرت کو اگر روشن کیا جائے تو اہل مغرب کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی | شاہ ولی اللہ غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ انہوں نے مروجہ علوم کی تحصیل صرف پندرہ سال کی عمر میں ہی مکمل کر لی۔ باطنی علوم کے فیضان اور تحقیق کے سلسلے میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ شاہ صاحب کی تعلیم کا اہتمام زیادہ تر اپنے والد بزرگوار کی زیر نگرانی ہوا۔ اور زیادہ تر اکتساب ان ہی سے کیا۔ علم حدیث، تفسیر، علم فقہ، منطق، علم کلام، سلوک و تصوف، طب، فلسفہ اور ہیئت و حساب جیسے مضامین میں خاصی دسترس حاصل کی۔ اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جلد ہی آپ کے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پہنچ گئی۔ دور دراز سے تشنگان علوم و معارف آپ کے تلامذہ میں شامل ہوتے۔ آپ نے بارہ سال تک متواتر درس و تدریس کے کام کو جاری رکھا اور اسی دور میں آپ نے مختلف علوم کی فہمائش میں بڑا مقام حاصل کیا۔ آپ کے دل و دماغ میں تحقیق و تجسس کا وہ جذبہ پیدا ہوا جس کی خاطر آپ نے حجاز کا سفر اختیار کیا۔ قیام حرمین کے زمانے میں شاہ صاحب متعدد علماء و مشائخ سے کسب فیض کرتے رہے۔ مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم مدنی سے سند حاصل کی۔ شیخ ابو طاہر شاہ صاحب کے بڑے معتقد تھے۔ فرمایا کرتے تھے ولی اللہ الفاظ کی سند مجھ سے لیتے ہیں اور میں معنی کی سند ان سے لیتا ہوں۔

حجاز سے واپسی پر شاہ صاحب نے اپنے والد کے ایک چھوٹے سے پرانے مکان میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اور وہ "مدرسہ رحیمیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ جب آپ کے علمی کمالات کا شہرہ دور دراز تک پہنچا تو چند ہی دنوں میں طلباء کا ہجوم ہو گیا۔ اور جگہ کی تنگی کا احساس ہونے لگا۔

بادشاہ وقت سلطان محمد شاہ نے یہ حالات دیکھ کر شاہ صاحب کو بلا بھیجا اور شہر میں ایک عالیشان حویلی دے دی۔ آپ نے یہاں دار الحدیث کا افتتاح فرمایا۔ اب یہ نیا مدرسہ ایک بڑا دار العلوم سمجھا جانے لگا جناب شاہ صاحب نے بڑے انہماک سے درس و تدریس کا کام جاری رکھا۔ یہ سلسلہ کئی پشتوں تک اس خاندان میں چلتا رہا۔ بالآخر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ مدرسہ تباہ ہو گیا۔

جناب شاہ صاحبؒ نے تعلیم و تدریس کے زمانے میں اپنے اوقات کار کو یوں تقسیم کر رکھا تھا۔

۱۔ صبح کی عبادت سے فارغ ہوکر دوپہر تک طلبا کو درس حدیث دیتے۔
۲۔ معرفت وتصوف کے اسرار وغوامض پر بحث فرماکر سامعین کو مستفید فرماتے۔
۳۔ آپ نے ہر فن کے لئے ایک فرد تیار کر لیا تھا جس فن کا جو طالب علم ہوتا اس کو اسی فن کے استاد کے سپرد کر دیتے۔ یہ معلم حضرات آپ ہی کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے۔ مدرسہ ان ہی کے سپرد تھا۔ خود آپ حدیث کے معارف بیان فرماتے اور تصنیفات میں محو رہتے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی شاہ صاحب کے کارہائے نمایاں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اور سب سے بڑا کام کم از کم میرے ناچیز خیال میں شاہ صاحب کا یہ ہے۔ کہ سب سے پہلے انہوں نے ہندوستان میں قرآن وحدیث کے ترجمے کی بنیاد بڑی جرأت اور ہمت سے کام لے کر ڈالی۔ اگرچہ خود انہوں نے فارسی میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ اور حدیث کی قدیم ترین کتاب موطا امام مالک کا بھی ترجمہ فارسی میں کیا۔ ان کے زمانے تک غالباً اردو عام طور سے لکھنے پڑھنے کی زبان نہیں بنی تھی۔ عوام فارسی ہی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ لیکن جوں ہی اردو نے قدم آگے بڑھایا اور اس راہ میں اس نے بڑی تیزی دکھائی۔ تو محض اس لئے کہ شاہ صاحب کا نمونہ فارسی میں موجود تھا۔

آپ کے صاحبزادوں میں سے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے بامحاورہ اردو میں اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے لفظی ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل فرمائی۔

شاہ صاحب نے مسلم معاشرے کی تربیت واصلاح کا ایک واضح تعلیمی پروگرام مرتب کیا۔ اور اسے عملی طور پر اپنایا۔ آپ نے تدریسی معاملات میں رہنمائی اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی جو ذیل میں پیش خدمت ہے۔

۱۔ صرف ونحو کے چند اصول حسب استعداد طلبا کو حفظ کرا دیتے۔ اس کے بعد حکمت یا تاریخ کی کوئی عربی کتاب پڑھا دی جاتی۔
۲۔ عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جانے کے بعد موطا امام مالک کا درس دیا جاتا۔
۳۔ قرآن مجید کا ترجمہ بغیر تفسیر کے پڑھایا جاتا۔ البتہ جہاں کہیں کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا۔ اس کی تشریح کر دی جاتی۔
۴۔ تفسیر جلالین پڑھائی جاتی۔
۵۔ کتب احادیث وفقہ اور حکمت کا مطالعہ کرایا جاتا۔

تدریس کے یہ درجات آپ نے خود مقرر فرمائے اور ان کا وضع کردہ طریقہ بڑا مفید اور کامیاب رہا۔

حکیم الامت مولانا تھانویؒ حضرت مجدد الملۃ حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ علمائے متاخرین میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کے متعلمین، مریدین اور معتقدین سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تھے۔ آپ کے

"مجازین" کی تعداد ۱۲۹ تک پہنچتی ہے جس میں ۷۰ مجازین بیعت ہیں۔ جن کو اصطلاح عام میں "خلفاء" کہا جاتا ہے۔ اور ۵۹ مجازین بیعت ہیں جن کو بیعت کرنے کی تو اجازت نہیں لیکن صرف تبلیغ کی اجازت ہے پھر مذکورہ ۷۰ خلفاء میں نہ صرف ہیں جو علوم ظاہری پر کم عبور رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ بھی ہیں جو اپنے وقت کے علامہ اور اپنے دور کے کامل اساتذہ ہیں۔

آپ بڑے کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ آپ کی تصانیف عربی۔ فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے آپ کی تصانیف میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان میں تفسیر، حدیث۔ فقہ۔ کلام و عقائد، سلوک و تصوف غرض کہ ہر موضوع کی کتابیں شامل ہیں۔

آپ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تو کچھ عرصہ تک مدرسہ فیض عام کانپور میں درس دیتے رہے۔ پھر کانپور ہی میں جامع العلوم کے نام سے ایک اور مدرسے کی بنیاد ڈالی جہاں چودہ برس درس و تدریس میں مصروف رہے اور اس عرصہ میں آپ کے فیض تعلیم سے بیسیوں اہل کمال پیدا ہوئے جنہوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل کر نور پھیلایا۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ امت مرحومہ کا ہر فرد دینی علوم کے حصول میں کوشاں رہے۔ اس سلسلے میں منجملہ اور کتابوں کے آپ نے "التلخیصات العشر" نامی ایک کتاب لکھی جس میں آپ نے بحیثیت ایک عظیم ماہر تعلیم کے نصاب تعلیم کی تشکیل نہایت سہل اور آسان طرز پر کی۔ اس خاص طرز نصاب کے بارے میں آپ ضمان التکمیل فی زمان التعجیل کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

"اس کی تجویز دو غرض سے ہوئی۔ اول جن لوگوں کو ضرورت تحصیل معاش یا کسی اور عارض کی وجہ سے مہلت کم ہے اور اس کے ساتھ ہی علوم دینیہ میں فاضلانہ استعداد حاصل کرنے کی رغبت اور شوق ہے مگر درس متعارف کی تطویل کو دیکھ کر ہمت پست ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ ترک محض ہو جاتا ہے۔ اس سے ان کی تنگی رفع ہو جائے گی۔ دوسرے جو لوگ تحصیل علوم دینیہ کے لئے فارغ بھی ہیں ان کو بھی اتفاقات زمانہ سے احیاناً ان کے گمان کے موافق وقت نہیں ملتا۔ اور تحصیل کو درمیان میں قطع کرنا پڑتا ہے جن کے لئے التزام طریق متعارف کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بیش قدر وقت ملا کفاوہ علوم آلیہ میں صرف ہو گیا اور مقصود اصلی سے محروم رہے۔ اس طریق میں اس کا تدارک بھی ہو گیا ہے۔"

ایسے مدرس اور مربی کامل کے اصول تعلیمی جس کی آغوش تدریس و تربیت سے بڑے بڑے علماء فضلاء اور اولیاء نکلے۔ اس قابل ہیں کہ ان کا بطور خاص ذکر کیا جائے۔ ان کو سمجھا جائے اور ان پر عمل کر کے فائدہ اٹھایا جائے حضرت کے تعلیمی اصول مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ مدرس جو بھی مضمون پڑھائے اس میں خود زیادہ مشقت اٹھائے اور اس کو آسان ترین صورت میں شاگردوں کے آگے رکھ دے۔

۲- پیچیدہ مقام کو پہلے بہت ہی آسان پیرایہ میں سمجھا دیا جائے اور جب بات ذہن نشین ہو جائے تو اس مسئلہ کا اصطلاحی تعارف ہو۔

۳- طلبہ کے آگے ضرورت سے زیادہ تقریر نہ کی جائے۔ اور محض اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے زائد از ضرورت معلومات پیش کر کے اصل مطلب کو الجھا نہ دیا جائے۔

۴- ہفتہ وار تقریروں اور مباحثوں کا اہتمام نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس کے باعث طلبا کی توجہ اسی ایک موضوع تقریر و بحث کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل درس سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ نصاب کی تکمیل اچھی طرح ہو جائے تو پھر تقریر و مناظرہ سب کچھ آجاتا ہے۔ ورنہ ہمیشہ کے لئے خامی رہ جاتی ہے

۵- طلبہ میں استعداد علمی پیدا ہونے کے لئے مندرجہ ذیل امور نہایت ضروری ہیں:-

ا- وہ آئندہ سبق کا مطالعہ کر کے معلومات اور مجہولات میں تمیز پیدا کرے۔

ب- پھر جب استاد سمجھانے لگے تو بلا سمجھے آگے نہ بڑھے۔

ج- جب سمجھ جائے تو خود بھی اسی مطلب و مفہوم کی تقریر کرے۔

یہ تین باتیں تو واجب ہیں۔ ایک بات درجہ استحباب کی ہے وہ یہ کہ کچھ آموختہ روزانہ پڑھ لیا کرے۔ اب یاد یا نہ رہے استعداد انشاء اللہ ضرور پیدا ہو جائے گی۔

۶- اب تک طریقہ یہ ہے کہ پہلے طالب علم عبارت پڑھتا ہے اور مدرس مطلب بیان کر دیتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ شبہ ہوا تو دریافت کر لیا۔ ورنہ آگے چل پڑے۔ یہ طریق مبتدیوں بلکہ متوسطین کے لئے بھی غیر نافع ہے۔ اس میں اصلاح کی ضرورت یہ ہے کہ خود طلبہ کی استعداد سے کام لیا جائے۔ بلا ضرورت ان کی امداد نہ کی جائے۔ خود ان ہی سے مطلب کی تقریر کرائی جائے۔ نیز ہر قاعدہ و مسئلہ کی کثرت امثلہ سے مشق کرائی جائے۔

۷- کسی طالب علم کو اس کی مناسبت یا دلچسپی کے خلاف علوم سیکھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اور نہ ہی اس کو اس وجہ سے محروم سند کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی معقولات نہ پڑھے اور محض دینیات پڑھے تو اسے بھی سند ضرور دی جائے۔ اور سند میں بجائے "درسیات" کے (جو معقولات اور دینیات کی جملہ کتابوں پر حاوی اصطلاح ہے) صرف "دینیات" لکھا جائے۔

۸- مدارس میں یہ انتظام ہونا ضروری ہے کہ دس دس۔ بیس بیس لڑکوں پر ایک معمر نگران مقرر ہو جو ان امور کی نگرانی رکھے کہ کسی بڑے طالب علم سے نہ ملنے دے۔ نگران سے الگ ہو کر آپس میں باتیں نہ کریں۔ ان کے نام جو خطوط آئیں وہ بھی دیکھ کر دے۔ ان کے سر منڈا رہے۔ پان نہ کھانے دے۔ لباس سادہ ہو۔ نماز و جماعت میں ان کی حاضری کی فکر رکھے۔ تفریح یا کسی ضرورت سے بازار وغیرہ جائیں تو ان کے ساتھ رہے۔

کتابیات

۱۔ ابن خلدون۔ ترجمہ مولانا حامد حسن خان یوسفی "مقدمہ ابن خلدون" نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی ۱۹۵۹ء

۲۔ تاریخ التعلیم۔ محمد مختار قریشی۔ پنجاب کتاب گھر۔ اردو بازار۔ لاہور

۳۔ مفکرین تعلیم۔ پروفیسر ضیاء الدین احمد۔ اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

۴۔ پاکستان میں تعلیم کا تناظر۔ جی۔ اے بخاری۔ جاوید بک ڈپو۔ کوئٹہ

۵۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا مناظر حسن گیلانی

۶۔ تاریخ التعلیم۔ محمد مختار قریشی۔

۷۔ سو بڑے مسلمان۔ جمیل احمد

۸۔ تاریخ تعلیم۔ پروفیسر حامی الدین خان

۹۔ بیان القرآن۔ حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ

۱۰۔ التلخیصات العشر حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ

۱۱۔ بوادر النوادر۔ حکیم الامت کے نقوش حیات۔ از غلام محمد صاحب (بی اے عثمانیہ)

۱۲۔ فن تعلیم و تربیت۔ افضل حسین

بقیہ افغانستان میں روسی مداخلت

بنیادی رکن ہے۔ افغانستان میں روسی فوجی مداخلت کے خلاف فوری ردِعمل فطری طور پر برادر اسلامی ممالک ہی کی طرف سے ہوا۔ بنگلہ دیش کی تجویز پر اسلامی وزرائے خارجہ کا ایک ہنگامی اجلاس ۱۹۸۰ء کے اوائل میں اسلام آباد میں منعقد ہوا جس میں روسی فوجی مداخلت پر سخت تنقید کی گئی۔ اور اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی فوجیں افغانستان سے فوراً اور غیر مشروط طور پر واپس بلالے۔ کانفرنس نے ببرک کارمل کی غیر نمائندہ کمیونسٹ ملک کو افغانستان کی جائز حکومت ماننے سے انکار کیا۔ اور کانفرنس میں اسکی رکنیت معطل کردی۔ اسکی بجائے افغان مجاہدین کے نمائندوں کو اجلاس سے خطاب کرنے کی اجازت دیدی۔

افغان بحران کا سیاسی حل تلاش کرنے کیلئے کانفرنس نے پاکستان ایران اور کانفرنس کے سیکرٹری جنرل جناب حبیب شطی پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی۔ جو روسی افواج کے انخلا کیلئے کوشش کے ساتھ ساتھ افغانستان کے اندرونی بحران کا سیاسی حل نکالنے کیلئے متعلقہ فریقوں سے بات چیت کرے گی۔ تاہم روس کی مخالفت کی وجہ سے یہ کمیٹی اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے بعد طائف کی اسلامی سربراہ کانفرنس میں افغانستان پہلے کیطرح اہم موضوع بنا رہا۔ لیکن اسلامی ملکوں کے درمیان تنازعات نے کانفرنس کو اتنا کمزور کردیا ہے۔ کہ وہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کرسکی۔ اس کے باوجود افغانستان کا مسئلہ اسلامی کانفرنس کے ایجنڈے پر سرفہرست ہے۔ اور اس کا کوئی قابل قبول حل نکالنا اسلامی کانفرنس کے ذمے ہے۔